Dareecha-e-Tahqeeq

دریچۂ تحقیق

ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 4, Issue 1
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

ڈاکٹر قمر عباس
اسسٹنٹ پروفیسر اردو، نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس لاہور سب کیمپس ملتان
ڈاکٹر مظہر اقبال کلیار

ڈاکٹر طاہر تونسوی کی غزل: ایک تجزیاتی مطالعہ

Dr. Qamar Abbas
Assistant Professor Urdu, National College of Business Administration and Economics Lahore Sub Campus Multan
Dr. Mazhar Iqbal Kalyar

Dr. Tahir Taunsvi's "Ghazal" :An Analytical Study

Dr. Hafeez Ur Rehman Tahir Taunsvi is famous for his valuable work in the field of Urdu research and criticism. His poetry, especially his "Ghazal" is also a significant part of his literary services. This aspect of his personality is mostly overpassed by the critics. His collection of poetry " تو-- طے ہوا انا، " published in 2001 AD. It has great value due to its diction, style and themes. Dr. Tahir Taunsvi's "Ghazal" has beautiful colors of traditional and modern poetry. His "Ghazals" present the romantic atmosphere of love and beauty in an artistic style. Besides this, the optimistic and progressive approach increases the worth and value of his themes and style. It has great resistance against the exploitation and oppression. His "Ghazal" also promotes the great human and moral values. One can see the personal tragedy transforming into the grief of humanity in his "Ghazals". In this article, the authors have presented an analytical study of Dr. Tahir Taunsvi's Poetics.

Keywords: Criticism, Significant, Overpassed, Collection, Style, Themes, Traditional, Romantic, Artistic, Optimistic, Progressive, Exploitation, Resistance

کلیدی الفاظ: گل و بلبل، عشق و محبت، طاہر تونسوی، اسالیب

غزل اردو شاعری کی جاندار اور اہم صنف ثابت ہوئی ہے۔ اس صنف سخن میں شائستگی کے جو نقوش ملتے ہیں وہ اردو شاعری کی کسی دوسری صنف میں موجود نہیں۔ غزل ہمیشہ لکھنے والوں میں بھی مقبول رہی ہے اور پڑھنے والوں میں بھی۔ آغاز میں اس نے گل و بلبل اور عشق و محبت کو احسن انداز میں پیش کیا۔ غزل نے موضوعات و اسالیب کے کئی رنگ دیکھے ہیں۔ ہر عہد میں اسکی مقبولیت موجود رہی ہے۔ اس کے پرستار اسکی ساخت اور پرداخت میں اپنا خون جگر صرف کرتے رہے ہیں۔ غزل کا دامن بے پناہ وسعتوں کا امین رہا ہے۔ اس میں اس قدر امکانات ہیں کہ یہ مستقبل کے تقاضے بھی پورے کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ہر جذبہ اس کے حسن کو سنوار سکتا ہے۔ ذاتی اور داخلی احساسات کے ساتھ ساتھ خارجی منظر بھی اس میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کا کلام ملک کے اہم رسائل و جرائد میں چھپتا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں طاہر تونسوی خود لکھتے ہیں:

" _____ علاوہ ازیں "فنون" اوراق، نگار، ماہ نو، اقتدار، ادبیات، تخلیق، گل بکف، اہل قلم، قندیل اور دوسرے رسائل میں میرا کلام شامل ہوتا رہا اور اس کا ایک اچھا نتیجہ یہ

 Corresponding Author's Email: qamarabbasrana74@gmail.com

نکلا کہ شاعری کے انتخاب اور اس سلسلے کے کئی مجموعوں میں میری غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔"(۱)

ڈاکٹر طاہر تونسوی کا کلام کئی انتخابی مجموعوں کی زینت بھی بن چکا ہے۔ڈاکٹر محمد عاشق خان لکھتے ہیں:

"چنانچہ اردو کی شعری تخلیقی فضا میں وہ کسی نہ کسی صنف سخن کے ذریعے متعارف رہے ہیں۔ان کا ذکر اور انکے کلام کے حوالے مختلف انتخابی مجموعوں میں شامل رہے ہیں۔مثلاً ان کا کلام مندرجہ ذیل مجموعوں میں شریک اشاعت رہا ہے۔بیادِ شاعر مشرق (مرتبہ ناصر زیدی)، بحضورِ اقبال (مرتبہ مصباح الدین صدیقی)، باب العلم (مرتبہ حسین سحر)، روشنی لہو لہو (مرتبہ احمد پراچہ)، مشاعرہ ۱۹۸۹ء (مرتبہ حامد نواز شیخ)، غزل ۱۹۸۹ء (مرتبہ قائم نقوی)، عشقیہ غزلیں (مرتبہ تنویر شاہد محمد زئی)، عالمی مشاعرہ ۱۹۹۱ء (مرتبہ محمد حمید اللہ شیخ)، شہر سخن (مرتبہ احمد سلیم مظہر چغتائی)، غزل ۱۹۹۱ء (مرتبہ قائم نقوی)، عہد ساز غزلیں (مرتبہ ثنااللہ شاہ)، گل پاشی (مرتبہ منصور احمد)، اردو کی نمائندہ غزلیں (مرتبہ اعزاز احمد آذر)، لہو پکارے گا آستیں کا (مرتبہ فرید خاں)، عالمی مشاعرہ (مرتبہ عبدالقادر میمن)۔ان مجموعوں میں طاہر تونسوی کی جو تخلیقات شامل ہیں اُن کی تفصیل اس طرح ہے۔روحِ آدم کا مسیحا، مجھے خبر ہے یہ میرے وجدان نے کہا ہے، ولایت کا اسمِ اول، منظر وہ شامِ غم کا لہو منظروں میں تھا، شکستِ دل کا اب آخر حساب کیا رکھنا، دل کو وہ ہمالہ تھا مگر ہجر کے مارے، کرے تلاش مگر حرفِ معتبر نہ ملے، جو ہو سکے تو مرے حق میں فیصلے لکھنا، قدم زمین پہ رکھے اور آسماں دیکھا، تو طے ہوا نا کہ جب بھی لکھنا، ندیم صاحب کیلئے ایک نظم، شکست دل کا اب آخر حساب کیا رکھنا۔"(۲)

غزل کا مزاج وہی شاعر بخوبی سمجھ سکتا ہے جو اپنے لئے اسلوب کے نئے راستے تلاش کرتا ہے۔برصغیر میں ہونے والی شاعری خاص طور پر غزل میں نئی فکر کی آبیاری کرنے والوں میں ڈاکٹر طاہر تونسوی انفرادیت رکھتے ہیں۔ان کی غزل میں معروضی حقائق، زمینی حالات، تہذیبی منظر نامے، عشق، محبت کی رومانوی کیفیات اور سادگی کا حسن ملتا ہے۔ڈاکٹر طاہر تونسوی زود گو شاعر نہیں لیکن اُن کے ہاں تجربے اور مشاہدے کا جو شعوری احساس ملتا ہے وہ انہیں دور جدید کے شعراء میں اہم مقام عطا کرتا ہے۔ ان کی غزل کے اہم موضوعات درج ذیل ہیں:

ڈاکٹر طاہر تونسوی کی غزلیہ شاعری ایک طرف روایت سے ہم آہنگ ہے اور دوسری طرف جدت اظہار سے فکر و فن کے نئے در کھولتی ہے۔اُن کی غزلیات نے اردو غزل کی روایت کے تمام رنگ اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔معاملات حسن و عشق اردو کی غزلیہ شاعری کا ایسا موضوع ہے جو غزل کی روایت میں ہر دور میں نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔محبوب کا سراپا، عاشق و محبوب کی مختلف کیفیات، ہجر و فراق کی کسک، لمحات وصل میں راز و نیاز کی باتیں، محبوب کیلئے عاشق کی بے قراری، محبوب کی بے اعتنائی اور ستم ظریفیاں یہ سب کچھ اردو غزل کا وقار اور پہچان ہیں۔ڈاکٹر طاہر تونسوی کی اردو غزل حسن و عشق کی یہ تمام کیفیات اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ڈاکٹر طاہر تونسوی کی غزل میں عشق کا تصور روایت کے ساتھ جڑا ہوا بھی ہے اور اپنے اندر انفرادیت بھی رکھتا ہے۔عشق ایک ایسا جذبہ بن کر ابھرتا ہے جس میں انقلاب آفریں قوت موجزن ہے۔جو تیرگی کے سمندر میں گم شدہ شعور انسانی کو عظمتوں کا سفیر بنا دیتا ہے۔عاشق کا یہ سفر طویل اور مضمحل کر دینے والا ہوتا ہے لیکن اس سفر عظیم میں بناوٹ، منافقت اور دھوکے کی کوئی گنجائش نہیں۔اور عشق کی یہ تاثیر اور قوت انسان کو معراج کی اس منزل پر لے جاتی ہے جہاں پر وہ غیر موجود چیزوں کو محسوس کر سکتا ہے اور وہ خود حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔پھر عشق میں فناہ کی وہ منزل بھی آتی ہے کہ عاشق راہ عشق میں بکھر کر خاک ہو جاتا اور اس خاک کو ہوائیں اڑا کر لے جاتی ہیں مگر ایک عاشق صادق کے وجود کی بکھری ہوئی خاک حسن محبوب کو مرکز و محور بنائے رکھتی ہے اور یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں من و تو کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔اور وجود کی دوئی وجود کی ایکتا میں تبدیل ہو جاتی ہے۔جذبہ عشق کے تحت عاشق کی جستجوئے منزل میں رکاوٹیں تو بہت آتی ہیں اور منزل مقصود ایک خون آشام منزل لگنے لگتی ہے لیکن یہ جذبہ خود ہی حالات ساز گار بنا لیتا ہے اور برف پگھل جاتی ہے اور عاشق دریا کے پار منزل مقصود پر پہنچ ہی جاتا ہے۔عشق کی تاثیر بقول شاعر:

میں تیرگی کے سمندر میں گم تھا مدت سے
جنون شوق کہاں لایا ورغلا کے مجھے
حیرت ہے کہ لایا ہے کہاں میرا مقدر
محسوس یہ ہوتا ہے تجھے دیکھ رہا ہوں
ہوائیں گرچہ اڑا لے گئی تھیں خاک مری
مرا وجود بکھر کے تمہیں کو تکتا تھا

(۳)

معاملات حس و عشق میں لمحات وصل عاشق اور محبوب کیلئے جہاں جانفزا، روح پرور اور دلکش کیفیات سے معمور ہوتے ہیں وہیں محبوب کی طرف سے تھوڑی سی غفلت، عدم توجہی اور بے اعتنائی سے عاشق کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔اردو غزل کا یہ روائتی مضمون طاہر تونسوی کی غزل میں ذاتی تجربہ معلوم ہوتا ہے۔

لیکن اس روائتی مضمون کو اس منفرد آہنگ کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اس میں جدت اور تازگی محسوس کی جاسکتی ہے۔ وصل کے لمحات میں عاشق اور محبوب خود فراموشی اور وارفتگی کے عالم میں آپس میں محو راز و نیاز ہوتے ہیں تو انہیں اس کیف و سرور میں ہی کائنات نظر آتی ہے۔ عاشق اپنے دل کے ہاتھوں مجبور اور محبوب کی خوشی کے حصول کیلئے حد درجہ محتاط کہ محبوب کو کوئی دوسرا دیکھ بھی نہ لے۔ محبوب کے ساتھ گلے شکوے، تکمیل وعدہ کا انتظار، دوسری طرف محبوب کہ اسے خط لکھنے کیلئے کبھی الفاظ نہ ملیں اور کبھی نامہ بر میسر نہ آئے۔ عاشق کی محبت کا یہ عالم کہ محبوب کا عکس بھی اسے لمس محبوب کا مزا دے جاتا ہے۔ اور عاشق بے ساختگی سے محبت کا اظہار بھی کر دیتا ہے۔ عاشق و محبوب کی محویت و وارفتگی کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

نہ تو نے حال سنایا نہ میں نے کچھ پوچھا
کہ تو سرور میں بیٹھا تھا میں خمار میں تھا
وہ انتظار کا لمحہ وہ بے خودی طاہر
وہ آکے جا بھی چکے تھے میں انتظار میں تھا
بارش کے بعد سارے شجر تھے دھلے ہوئے
عکس بدن بھی اسکا مزا دے گیا مجھے

(۴)

عاشق جب وصل محبوب کی روح پرور رومانوی کیفیات سے سرشار ہو جاتا ہے تو محبوب کا حسن و جمال اس کے دل و نگاہ کا مرکز بن جاتا ہے اور وہ والہانہ اظہار محبت کرتا ہے۔ اور محبوب کے ساتھ اپنے جان و دل کی وابستگی کا یوں اظہار کرتا ہے:

تیری ہی راہ پہ آنکھیں لگی ہیں
کہ آنے کا ترے مجھ کو یقیں ہے
میں دن میں بھی ترے ہی خواب دیکھوں
تری چاہت مرے دل کی مکیں ہے

(۵)

محبت کے اظہار کا انوکھا انداز اور خوبصورت پیش کش:

میں اسکے خواب بنوں اس کو اوڑھ کر دیکھوں
سکوں ملے نہ ملے سایہ شجر نہ ملے

(۶)

اور پھر محبت کی طلب کا منفرد انداز یوں اختیار کرتے ہیں:

رانجھے کا روپ دھار کے طاہر ہے تیرے پاس
اے ہیر دکھ ہی ڈال دے کشکول سنگ میں

(۷)

عاشق اور معشوق کا محبت و وابستگی کا تعلق جیسے جیسے گہرا ہوتا ہے۔ دونوں کو ایک سمت اور محور میسر آجاتا ہے جس کے نتیجے میں عاشق کا دل و نظر حسن محبوب کا ہر وقت منتظر رہتا ہے اور محبوب ہر وقت عاشق کو سوچتا ہے۔ طاہر تونسوی کے ہاں محبت یکطرفہ نہیں ہے دوطرفہ ہے اور دونوں طرف آگ تو لگی ہوئی مگر یہ آگ برابر کی آگ نہیں ہے۔ عاشق میں یہ آگ کچھ زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ شاعر کے مشاہدہ کی گہرائی کو داد دینے کو دل کرتا ہے جب وہ عاشق و محبوب کی اس کیفیت کو بیان کرتا ہے جب اُن کے دلوں میں ایک طرف محبت رچ بس جاتی ہے تو دوسری طرف بے یقینی، وہم جدائی اور فراق کا اجنبی خوف پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور وہ آپس میں اس انجانے نفسیاتی الجھاؤ کا شکار بھی نظر آتے ہیں۔ اس کیفیت کو وہی بیان کر سکتا ہے جو اس کیفیت کے تجربہ سے گذرا ہو۔

دوطرفہ محبت کے حوالہ سے اشعار:

یہی نہیں کہ تری زلف کے اسیر ہوئے
کیا ہے تم کو بھی جاناں شکار ہم نے بھی
گذر چکے ہو کئی بار کر بلا سے تم
دل و نظر کو کیا ہے نثار ہم نے بھی
گذر سکو گے ادھر سے نہ تم بنا دیکھے
بنائی ایسی ہے لوح مزار ہم نے بھی

(۸)

اب عاشق کی کسک اور بے قراری کی کیفیت اور محبوب کی سرد مہری اور بے التفاتی پر عاشق کا اضطرار اور بے اختیاری ایک فطری بات محسوس ہوتی ہے۔اس کیفیت کا بیان ذاتی تجربہ کے بغیر ممکن نہیں:

؎ مجھے یہ خوف کہ اسکو کہیں ہوا نہ لگے
وہ شخص جس کو خود اپنا بھی کچھ پتا نہ لگے

؎

کرے تلاش مگر حرف معتبر نہ ملے
؎ اگر ملے تو اسے کوئی نامہ بر نہ ملے
شکستِ دل کا سبب پوچھتے ہو تم مجھ سے
یقیں نہیں کہ تجھے اتنی سی خبر نہ ملے (۹)

ہجر و فراق عشق و محبت کا لازمی حصہ ہیں۔ غزل کی روایت میں جہاں رومانوی کیفیات کا بیان ہے۔ وہاں محبوب سے جدائی کے لمحات کی کسک بھی موجود ہے۔ طاہر تونسوی کی غزل میں کلاسیکیت کا گہرا رنگ موجود ہے۔ انکی غزل کا عاشق وصل محبوب کی رعنائی سے صرف لمحہ بھر کیلئے آشنا ہوتا ہے۔ فراق اسکا دائمی مقدر بن جاتا ہے۔ اور جدائی کے لمحات اس کیلئے خوں ناب بن جاتے ہیں۔ اس کیلئے تمازت شب ہجراں ابدیت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایسے میں محبوب کے پلٹ کر آنے کی آرزو اور تمنا تو ہوتی ہے۔ لیکن یہاں عاشق کی قسمت میں صدیوں کے رت جگے ہی باقی رہ جاتے ہیں۔ عاشق محبوب کو سو سو بار پکارتا ہے مگر بے سود۔ اسطرح ہجر محبوب کی اذیت کوہ ہمالہ جیسے مضبوط دل کو بھی آزردہ خاطر کر دیتی ہے اور پھر دوست احباب سمیت کسی کی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہوتی:

؎ تمہارے قرب کا موسم فقط اک پل فقط اک پل
جدائی کے مگر لمحے بڑے خوں ناب لگتے ہیں
؎ تمازت شب ہجراں ازل نصیب ہوئی
تمام عمر گزاری پہ ہم سفر نہ ملے
؎ کواڑ بند کئے ہی نہیں ہیں آنکھوں نے
مرے حساب میں صدیوں کے رت جگے لکھنا
؎ سو بار پکارا ہے تجھے دشت جنوں میں
سو بار تجھے پانے میں ناکام رہا ہوں

(۱۰)

ڈاکٹر طاہر تونسوی کی غزل میں غم و الم انکی ذات کا المیہ بھی ہے اور انکے سماج کا بھی۔ اُن کو اپنی زندگی میں کئی نا مساعد واقعات کا سامنا رہا۔ وہ ششم جماعت کے طالب علم تھے کہ اُن کے والدنے دوسری شادی کر لی اور وہ شفقت پدری سے محروم ہو گئے۔ انکی تربیت والدہ اور چچا نے کی۔

جوانی میں والد نے جائیداد سے عاق کر دیا۔ سرکاری ملازمت سے پہلے فکر معاش نے کراچی کا سفر کرنے پر بھی مجبور کیا اور سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں پنجاب کے مختلف شہروں کی خاک چھانی۔ شادی ہوئی مگر چند سالوں بعد علیحدگی ہو گئی اور تمام عمر دوسری شادی نہ کی۔ اور ادب کی خدمت کیلئے وقف ہو گئے لیکن ادب میں بھی گروہ بندیوں کی وجہ سے انکی خدمات کا مناسب اعتراف نہ کیا گیا۔ غم جاناں کی شدید کسک کا بھی سامنا رہا۔ اس کے علاوہ وہ جس سماج کا حصہ ہیں وہ ایک جاگیردارانہ نظام ہے۔ انہوں نے اپنے اردگرد معاشرتی آزادیوں کو سلب ہوتے ہوئے دیکھا۔ غربت و افلاس کی چکی میں پستی ہوئی انسانیت کو دیکھا۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا جبر دیکھا۔ غیرت کے نام پر معصوم تمناؤں کا خون دیکھا۔ فرقہ واریت پھیلانے والے ملاؤں کا زہر دیکھا۔ ادیبوں، دانشوروں او ر اہل علم کو مصلحت کو ش ہوتے ہوئے دیکھا۔ اہل قلم کی زباں بندی کو دیکھا۔ کئی منصوروں کو تختہ دار پر لٹکتے دیکھا۔ حصولِ منزل کے بعد آدرشوں کی عدم تکمیل کے عذاب کو دیکھا۔ ایسے میں انفرادی غم اجتماعی غم میں ڈھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے جس کے بعد دل سے گل و بلبل کی باتوں کی بجائے نالہ و فریاد ہی سامنے آ سکتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی غزل میں غم والم کی بہتات ہے۔ انکی غزل کا درد، مایوسی اور ناامیدی کی سرحدوں کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ غم و یاس روائتی غزل سے ہم آہنگ ہے۔ ناکامی، نامرادی اور عدم تکمیل کا یہ احساس ان کی غزل میں داخلیت کو بھی پیدا کرتا ہے اور اس جذباتی غنائیت کو بھی جس کے بغیر اچھی شاعری وجود میں نہیں آتی۔ انکی غزل میں بدن کا استعارہ ایک کلیدی رمز کی حیثیت رکھتا ہے جو انکی شاعری کی وجودی علامات میں سے ہے اور محبوب کی تصوراتی تشکیل کا استعارہ بھی۔ لیکن بدن اور جسم کا استعارہ طاہر تونسوی کے ہاں جہاں محبت میں تکمیل آرزو کی علامت ہے وہاں اس میں ذات کے آشوب کے سارے قرائن بھی موجود ہیں یہ واحد استعارہ ہے جو بکھرنے کے دکھ اور سمٹنے کی آرزو کو شدت احساس کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ کہیں بدن حسی تجربہ ہے تو کہیں خوابوں کا ٹوٹتا ہوا سائبان ہے۔ کہیں یہ ذات ہے تو کہیں ذات کے اظہار کا ایک مادی وسیلہ ہے اور کہیں یہ محبوب کے جسمانی پیکر کا استعارہ ہے:

ے غموں کا چست لبادہ پہن لیا طاہرؔ
فصیل جسم پہ خود کو سجائے پھرتے ہیں

ے ہر ایک موڑ پہ خواب اپنے ریزہ ریزہ ہوئے
بکھرتا ٹوٹتا جسموں کا سائباں دیکھا

(۱۱)

ڈاکٹر طاہر تونسوی اپنے غم و آلام کے بارے میں خود کہتے ہیں:

''میری زندگی، سچی بات ہے غم و آلام سے عبارت ہے۔ خوشی کے مواقع بہت کم میسر آئے ہیں تاہم اس نعمت سے محروم بھی نہیں ہوں۔'' (۱۲)

ناکامی و نامرادی کا احساس اور حسرت و یاس کی شدت کو انکی شاعری میں جگہ جگہ دیکھا جا سکتا ہے:

ے لکھا نصیب میں جب ہے چراغ موسم زرد
اٹھا کے ہاتھ میں شاخ گلاب کیا رکھنا

ے ہری بھری کھیتیاں کہاں ہیں میرے مقدر کے زائچے میں
شہید عشق وفا کا طاہر ہتھیلیوں پہ حساب لکھنا

(۱۳)

انکی شاعری میں انفرادی غم کو اجتماعی غم میں ڈھلتا ہوا محسوس کیا جا سکتا ہے:

ے میں زخم زخم ٹنگا ہوں ہوا کی سولی پر
فصیل شہر سے اب مجھ کو مشورے لکھنا

ے وہ دھوپ ہے کہ مجھے سایہ بھی گراں گزرے
غموں کی لہر میں اب کوئی آسرا نہ لگے

ے ہر بار مجھے زخم ملے وقت کے ہاتھوں
ہر بار میں افلاس کی چکی میں پسا ہوں

ے میں کہ شاخ بے ثمر ہوں زندگی کی جھیل میں
غرق ہو جاؤں گا مثل موج آب نیل میں
ے غم کی ٹیسیں چین سے کب بیٹھنے دیں گی مجھے
درد کے عقرب پڑے ہیں عمر کی زنبیل میں

(۱۴)

طاہر تونسوی کی غزل میں اگرچہ غم والم کی بہتات ہے۔ غم ان کو جینے نہیں دیتا۔اور انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ زخم زخم ہوا کی سولی پر ہیں۔اور وہ مثلِ موج، آب نیل میں غرق ہو جائیں گے۔ لیکن ان کا یہ غم تخلیقی غم ہے۔اس سے اُن کی غزل میں قنوطیت پیدا نہیں ہوتی۔وہ مصائب وآلام میں گھرے ہوئے انسان کو ہمت و حوصلہ عطا کرتا ہے۔وہ غموں سے چور ہو کر مایوس ہو کر بیٹھ جانے کی طرف مائل نہیں کرتا بلکہ وہ غم والم میں ثابت قدمی سے کھڑے رہنے کیلئے استقامت کا درس دیتا ہے۔اس کے نزدیک شکست دل کو عذاب جاں نہیں بنانا چاہیے بلکہ امکانات دگر کی جستجو کرنی چاہیے۔کیونکہ دکھ کا رستہ خود ہی ایک دن منزل پر لے جاتا ہے۔انسان کو بس عزم وہمت سے کشتی جاں کی پتوار کو سنبھالے رکھنا چاہیے چڑھتا ہوا دریا خود ہی پسپائی اختیار کر لیتا ہے۔ شکستگی کو اپنی لغت سے نکال دینا چاہیے اور ہر مصیبت کے سامنے سینہ سپر ہو جانا چاہیے:

ے دکھ کا رستہ ایک دن منزل پہ خود لے جائے گا
اب اجالے ضوفشاں ہیں جسم کی قندیل میں

ے شکستگی کے معانی مری لغت میں نہیں
میں ٹوٹ جاؤں تو اس کو بھی زاوے لکھنا

(۱۵)

طاہر تونسوی کی شاعری میں نشاطیہ رجحان بھی ہے اور رجائیت بھی۔زندگی کی خوبصورتیوں اور دلکشیوں کی طرف رجوع بھی ہے۔کائنات کا حسن و جمال اور رعنائیاں انسان کیلئے ہیں۔چمنستان دہر میں رنگ و نور کا جشن اور اس میں کلیوں کے چٹکنے کی صدائیں انسان کو دعوت نظارہ بھی دیتی ہیں اور شعور زندگی بھی۔یہ دھوپ کی خوش رنگ ردا، شام کے بھیگے ہوئے رنگ، افق پر پھیلی ہوئی فضا سب کچھ انسان کیلئے ہے۔کہ وہ کائنات میں بھرپور اور خوشنما زندگی گزارے۔زندگی کے حسن سے منہ نہ موڑے بلکہ خوشیاں حاصل کرے اور خوشیاں بانٹے:

کلیوں کے چٹکنے کی صدا میرے لئے ہے
یہ جشن گلستان میں بپا میرے لئے ہے
میں شب کے اندھیروں کا پرستار نہیں ہوں
یہ دھوپ کی خوش رنگ ردا میرے لئے ہے
میں شام کے بھیگے ہوئے رنگوں میں گھرا ہوں
پھیلی ہے افق پر جو حنا میرے لئے ہے

ے طاہر حصار وقت سے چھوٹا وہی جمال
مدت سے انتظار تھا جس چاند رات کا
ے ہے کھیل سارا فقط برف کے پگھلنے تک
اتر ہی جانا ہے دریا کے پار ہم نے بھی

(۱۶)

طاہر تونسوی کے نزدیک ایک حسین چیز ابدی مسرت اور ایک بد صورت چیز ابدی اذیت کا باعث ہوتی ہے۔ حسین چیز چاہے خوبصورت پھول ہوں، لمس محبوب ہو، کسی عظیم فن پارہ کی تخلیق ہو، کوئی عظیم کارنامہ ہو یا کوئی بھی چیز وہ ابدی مسرت فراہم کرتی ہے۔ اس کے برعکس کوئی بھی فعل بد، محبوب کی بے وفائی، ظلم و جبر کی کوئی صورت جو انسان کے ساتھ وابستہ ہو ہمیشہ کیلئے باعث تکلیف ہوتی ہے۔ طاہر تونسوی کی غزل میں ''یاد'' ایک ایسا استعارہ ہے جو ان کے اس تصور کی وضاحت کرتا ہے۔ محبوب کی جدائی کی صورت میں اس کے ساتھ گزرے ہوئے حسین لمحات کی یاد شاعر کو وہی لذت و سرور مہیا کرتی ہے جو لذات و سرور اسے اصل صورت میں حاصل ہوا تھا۔ اور کچھ عرصہ کے لیے وہ غم جاناں سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ اور محبوب کی طرف سے ڈھائے گئے ستم کی یاد وہ زندگی کے کسی بھی لمحے میں آئے تو انسان کانپ اٹھتا ہے:

ے یادوں کے قمقموں سے سجا کر فصیل دل
تیرے بدن کا لمس مزا دے گیا مجھے

ے چاند کا رنگ کبھی پہلے تو یوں زرد نہ تھا
شاید اس کو بھی کسی شوخ کی یاد آئی ہے

ے وہ جس کی گرد کو صدیوں نہ پا سکے طاہر
جو بند کر لوں میں آنکھیں تو ماورانہ لگے

ے جو دونوں وقت بھی ملتے ہیں کانپ اٹھتا ہوں
ستم ہیں یاد کسی درد آشنا کے مجھے

(۱۷)

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے علم و ادب کی گرانقدر خدمت کی۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی تحقیق و تنقید کیلئے وقف کر رکھی ہے۔ اگرچہ درجنوں کتب ان کے اعتراف میں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن سرکاری سطح پر اُن کی خدمات کے اعتراف میں کوئی بڑا ایوارڈ نظر نہیں آتا۔ اس کی ایک وجہ ڈاکٹر صاحب کا دوٹوک اور بے باک انداز ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ ادبی گروہ بندیوں سے دور رہے۔ اس ناقدری زمانہ کا اظہار بھی انہوں نے اپنی شاعری میں کیا ہے:

ے مرے لہو سے رقم ہیں اگرچہ سب قصے
تمام شہر میں پھر بھی اسی کا چرچہ ہے

ے خلوص شہر میں ملتا نہیں ہے ڈھونڈے سے
خلوص دل کو ہم اپنے چھپائے پھرتے ہیں

ے چڑھتا ہوا سورج تو ہے یاروں کا مقدر
اور ڈوبتے سورج کی ضیا میرے لئے ہے

(۱۸)

ڈاکٹر جمیل الدین عالی نے اس سلسلہ میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے:

''ڈاکٹر طاہر تونسوی اگر وسطی پنجاب، کراچی یا اسلام آباد میں مقیم اور تعینات رہا کرتے تو ان کی شہرت اور توقیر انہیں ایک قابل ذکر ادارے کی حیثیت عطا کر دیتی مگر بڑے شہروں کی شاونیت زدگی اور اس کے اثرات قدیم سے ایسے جواہر قابل کو ان کا مقام نہ ملنے دینے کی راہ میں حائل رہتے ہیں۔ پاکستان میں بھی یہی روایت زندہ ہے۔ یہ تبصرہ تمام تاریخ ثقافت عالم پر محیط سمجھیئے، افسوس ناک مگر حقیقت واقعہ۔ گو میں یقین رکھتا ہوں کہ سو سوا سو برس میں رفتار و احاطہ ابلاغیت اس طلسم قدیم و جاریہ کو ہر جگہ توڑ کر رکھ دیں گے۔''(۱۹)

غالبؔ غزل میں جدت کے سب سے بڑے اور اولین علمبردار ہیں۔ انہوں نے غزل کے موضوعات کو بھی وسعت دی اور زبان و بیان اور طرز احساس میں بھی جدید رنگ اختیار کیا۔ غزل کا ایک جدید رنگ حالی سے بھی شروع ہوا۔ انہوں نے غزل کو اصلاحی مقصد کا آلہ کار بنایا۔ فکر اور مقصد کو اہمیت دی۔ قومی اصلاح انکے پیش نظر تھی۔ اقبالؒ جدت کے معاملے میں غالب کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں انہوں نے روایتی موضوعات سے ہٹ کر ایسے موضوعات پر غزلیں کہی ہیں جو انکے فکر و فلسفے سے ہم آہنگ تھے۔ اقبالؒ نے غزل کی مقصدیت کو مسترد نہیں کیا بلکہ اپنی غیر معمولی مفکرانہ اور شاعرانہ صلاحیتوں سے کام لے کر اس مقصدیت میں ایسی توانائی اور رعنائی پیدا کر دی ہے جو آج تک بے مثل ہے۔ مقصدیت کی یہ تحریک ترقی پسندوں تک پہنچی تو انہوں نے شدت کے ساتھ اس کو اپنی تحریروں میں اختیار کیا۔ ان کے نزدیک ادب برائے ادب کوئی

چیز نہیں ادب مقصد تک رسائی کا ایک وسیلہ ہے۔ یہ لوگ ادب میں خاص پیغام کی شمولیت چاہتے ہیں۔ اور اس پیغام کی مخلصانہ ترسیل ہی انکا بنیادی موقف اور نقطہ نظر ہے۔ ترقی پسند تحریک کے نزدیک نہ تو موضوع اہم ہے نہ ہی ہئیت بلکہ مقصد کو اہمیت دی جاتی ہے۔ معاشرتی استحصال، جبر اور ناانصافی کے خلاف صرف احتجاج کا رویہ ہی نہ تھا بلکہ معاشرے کو بدلنے کی شدید خواہش بھی تھی۔ دراصل یہ ایک مثالی ریاست کی تلاش تھی جو اس عہد کے شعراء کو موجودہ نظام کے خلاف اکساتی ہے اور وہ اس سے نجات پانے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی بھی اس سماج کا حصہ ہیں جہاں جبر کی کئی صورتیں اپنے عروج پر رہی ہیں۔ انہوں نے اپنے آبائی علاقے میں قبائلی اور خانقاہی نظام کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ انسان کو معاشی اور معاشرتی پابندیوں میں جکڑا ہوا، اپنے بنیادی حقوق سے محروم دیکھا۔ ملک کے اندر طبقاتی نظام کے ہاتھوں پستی ہوئی انسانیت کو دیکھا۔ وسائل پر چند خاندانوں کا غاصبانہ قبضہ، رائج سیاسی نظام کے تحت بکتے ہوئے ضمیروں اور قومی وقار کے سوداگر حکمرانوں کو دیکھا۔ معاشرتی آزادیوں کی پامالی کو دیکھا۔ غیرت کے نام پر بہنوں بیٹیوں کی معصوم تمناؤں کا خون ہوتے ہوئے دیکھا۔ اہل مذہب کے ہاتھوں ناحق ذبح ہوتے ہوئے معصوم شہریوں کو دیکھا۔ اپنے معاشرے میں ایسی گھٹن اور جبر کو دیکھا جس میں کوئی اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے کی پاداش میں سرعام موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ جاگیرداروں کا جبر دیکھا۔ سرمایہ داروں کا قہر دیکھا۔ ملاؤں کا زہر دیکھا۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں کا مشاہدہ کیا، ملک کو دولخت ہوتے ہوئے دیکھا، مارشل لاء، انسانوں اور آرزؤں کی پھانسیاں اور برستے ہوئے کوڑے دیکھے، عالمی کساد بازاری اور فسطائیت کا عروج دیکھا۔

ایسے ماحول میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کی غزل بھی ترقی پسندانہ خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ انکی غزل بھی ایک بڑے مقصد کا پیغام اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ وہ اپنے معاشرے کی فرسودہ روایات و اقدار کو توڑ کر اپنے معاشرے کو ایک مثالی معاشرہ بنانے کے خواہاں ہیں۔ اس لئے انھوں نے ہمیشہ اپنے قلم سے استحصالی قوتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ اس بارے میں وہ خود تحریر کرتے ہیں:

''ویسے تو ہر شاعر اپنے عصر کا ترجمان ہوتا ہے اور اسے ہونا بھی چاہیے مگر ہر خطے اور علاقے کے مخصوص حالات اور معاشرتی سماجی صورت حال ہوتی ہے۔ اس تناظر میں میرا تعلق خانقاہی نظام، قبائلی نظام اور جاگیردارانہ رویوں اور پابندیوں سے جکڑی ہوئی دھرتی سے متوسط ہے اور سفید پوش طبقے کا فرد ہونے کی حیثیت سے میں نے ہمیشہ اس سسٹم کے خلاف احتجاج کیا ہے اور اپنے قلم کو استحصالی قوتوں کی سازشوں کو بے نقاب کرنے کیلئے استعمال کیا ہے۔'' (۲۰)

ترقی پسند تحریک سے متاثر ہونے کا اعتراف ڈاکٹر طاہر تونسوی نے خود بھی کیا ہے۔ اس بارے میں سلطانہ مہر نے لکھا ہے:

''جب میں نے ڈاکٹر طاہر تونسوی کے سامنے سوالنامہ رکھا تو انہوں نے بڑی خوشدلی سے میرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ شاعری کے علاوہ تحقیق و تنقید سے میری گہری وابستگی ہے۔ میں اردو کی ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوں۔ البتہ ادب کے ذریعے پروپیگنڈے کا قائل نہیں۔'' (۲۱)

انہوں نے اپنی غزل میں بھی جبر واستحصال، قتل وغارت اور ناانصافی کے خلاف احتجاج کا رویہ اختیار کیا:

ے کس کس کو چڑھائے گا یہ سولی پہ زمانہ
میں آج بھی منصور کا نقشِ کفِ پا ہوں

ے آج کیا پھر کوئی منصور سردار چڑھا
آج کیوں وقت کے ہونٹوں پہ غزل آئی ہے

ے ہر سمت اٹھ رہی ہیں ہلاکت کی آندھیاں
اے آبروئے عظمت آدمؑ کدھر گئی

(۲۲)

انسانیت کی بے بسی اور ظلم ستم کی انتہا دیکھ کر شاعر ظلم ڈھانے والوں کیلئے عذاب کا طلبگار ہو جاتا ہے:

اے ربِ حشر اب کے ادھر بھی عذاب ہو
طوفانِ نوح آؤ ذرا اپنے رنگ میں

(۲۳)

کسی بھی معاشرے میں جب تک حق و صداقت کی بات کرنے والے لوگ موجود ہوتے ہیں اس میں بہتری کے امکانات کی امید باقی رہتی ہے۔ اہل قلم اور اہل فکر و دانش کسی معاشرے کی روح ہوتے ہیں۔ انہیں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ معاشرے کے ہر طبقہ کی سمت کو راہِ راست پر لائیں گے۔ اگر یہ طبقہ مصلحت کوش ہو جائے اور اپنے منصب سے گر کر گناہ کو ثواب، باطل کو حق کہنا شروع کر دے تو ایسے معاشرے ذلت و رسوائی کی طرف تیزی سے گامزن ہو جاتے ہیں۔ طاہر تونسوی نے اپنے معاشرے میں معاشرتی وسیاسی جبر کی وہ کیفیت بھی دیکھی جس میں اہل فکر و نظر خوف، لالچ اور مختلف عصبتوں کی وجہ سے نہ سچ بولتے ہیں نہ سچ سنتے ہیں بلکہ مصلحت کی سبیل جاری ہو چکی ہے اور لوگوں نے دل و نظر اور ذکر و فکر پر پہرے بٹھار کھے ہیں۔ طاہر تونسوی اپنی غزل میں معاشرتی اور سیاسی جبر پر گہرا طنز کرتے ہیں۔ اہل فکر و دانش کی مصلحت کوشی اور معاشرے کے مجموعی گھٹن زدہ ماحول کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ اور ہر قسم کے خوف، لالچ اور تعصبات کی نفی کر کے حق گوئی و بے باکی کا پرچار کرتے ہیں:

ے یہ دور اہل قلم پہ بھاری کہ مصلحت کی سبیل جاری
گناہ کو بھی ثواب کہنا، ببول کو بھی گلاب لکھنا

ے دل و نظر پہ وہ پہرے وہ ذکر و فکر پہ جبر
ہم انگلیوں پہ بھی تالے لگائے پھرتے ہیں

(۲۴)

مشکل وقت میں عزم وہمت اور صبر و استقامت عظمت انساں کی دلیل ہے۔ عام حالات میں انسانی صلاحیتوں اور اوصاف کا اندازہ ممکن نہیں۔ انسان کے شخصی اوصاف آزمائش اور امتحان کی گھڑی میں آشکار ہوتے ہیں۔ عظیم لوگ وہی ہوتے ہیں جو مشکل اور مصیبت کی گھڑی میں اپنے اعصاب پر مکمل طور پر کنٹرول رکھتے ہیں اور مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ اذیتوں کے سفر میں بھی حوصلوں کا بھرم ٹوٹنے نہیں دیتے۔ منافقت کے جہان میں بھی صداقتوں کا نصاب لکھتے ہیں۔ زندگی کی اعلیٰ اقدار موسموں کی ستم ظریفیوں کے سبب معدوم ہو گئی ہوں تو ناامید نہیں ہونا چاہیے بلکہ عزم نو سے اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے اور معاشرے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنا چاہیے۔ طاہر تونسوی کی غزل امید بندھاتی ہے اور استقامت بھی پیدا کرتی ہے:

اذیتوں کے سفر میں میں نے بھرم رکھا پھر بھی حوصلوں کا
منافقت کے جہاں میں مجھ کو صداقتوں کا نصاب لکھنا
ہوا کے ماتھے پہ درج تحریر موسموں کی تمازتوں سے
جو مٹ گئی ہے تو کیا ہوا ہے نئے سرے سے یہ باب لکھنا

(۲۵)

دُکھی انسانیت کا احساس بھی ڈاکٹر طاہر تونسوی کی غزل کا ایک اہم موضوع ہے وہ گلاب رت میں زندگی کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہونے والے انسان کی توجہ اس طرف دلاتے ہیں کہ غربت کی چکی میں پسی ہوئی انسانیت جو اپنی بنیادی ضروریات سے محروم ہے۔ جو استحصال کے سبب جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے میں مشکلات سے دوچار ہے اسے نظرانداز نہ کر بلکہ اسکے چہرے پر زردیوں کے نقوش پڑھ لینا اور ان پر بیتنے والے حالات کو دوسروں تک پہنچانا تاکہ ان کے کٹھن حالات آسانیوں میں بدل جائیں:

ے گلاب رُت میں یہ زردیوں کے نقوش چہرے پہ دیکھ لینا
ہمارے بارے میں کچھ نہ کہنا پہ عبرتوں کی کتاب لکھنا

ے ہر ایک موڑ پہ خواب اپنے ریزہ ریزہ ہوئے
بکھرتا ٹوٹتا جسموں کا سائباں دیکھا

(۲۶)

ڈاکٹر طاہر تونسوی کی غزل بیداری انسان کا فریضہ بھی سرانجام دیتی ہے۔ وہ انسان کو ظلم و ناانصافی کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے پر اکساتی ہے اور انقلاب کیلئے اُبھارتی ہے:

ے زنجیر عدل ٹوٹ چکی سن لو دوستو!
انصاف چیختا ہے لہو کی سرنگ میں

ے دستکیں دے کے تھک گیا پھر بھی نہ تیرا در کھلا
عرض ہنر کی بے بسی حرفِ سوال لے گئی

ے یوں ہم چلے کہ بے سرو سامانی رو پڑی
اندھے سفر میں حوصلہ ہی زادِ رخت ہے

(۲۷)

انسان کی بڑائی اور عظمت اس امر میں مخفی ہوتی ہے کہ اسکا کوئی بڑا مقصد ہو۔ اور اس مقصدِ عظیم کیلئے وہ کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کرے۔ مگر آج کا انسان اس حقیقت کو پس پشت ڈال چکا ہے۔ وہ اپنی ذات کے زندان میں قید ہے۔ اس زندان میں اس کے فکر و عمل کی پرواز اپنے مفادات سے آگے نہیں جاتی انسان ذات، برادری، نام و مرتبہ، دولت، زبان، رنگ، نسل، فرقہ، ملک کے قید خانوں میں بند ہو چکا ہے جس کے سبب ہر جگہ مفاد پرستی اور بے چینی کو دیکھا جا سکتا۔

انسان اپنے بدن کی جھیل سے نکلنے کیلئے تیار نہیں ہے۔ موجودہ دور صنم کدہ نام و ننگ بن چکا ہے۔ اسی سوچ و فکر سے معاشرے میں ایسے جنم لیتے ہیں اور انسان شرف انسانیت سے گر کر اپنے آپ کو چھوٹا کر لیتا ہے۔ معاشرہ ترقی کی بجائے پستی کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی غزل زندگی کی اعلیٰ اقدار اور بلند نصب العین کی طرف انسان کی رہنمائی کرتی ہے۔ انسان کو ہر قسم کے زندان سے رہائی دلاتی ہے۔ دنیا جو نام و ننگ، مال و دولت، رشتہ و پیوند کا صنم کدہ بن چکی ہے۔ اور انسان کی ساری کوششیں اپنے بدن کیلئے ہیں۔ ایسے میں انسان کو شعور حیات کے ہمدوش کر کے پستیوں سے نکال کر عظمت و رفعت کا ہمنوا بناتی ہے۔ انسان کے سامنے عظمت و شرافت کے اصل معیار رکھتی ہے تا کہ انسان عذرِ لنگ کو خیر باد کہہ کر حقیقت شناس بن جائے:

ے تم اپنی ذات کے زندان میں قید ہو طاہرؔ
جو لکھ سکو تو انہیں اپنے واہمے لکھنا

ے بدن کی جھیل سے نکلوں مگر یہ خواہش ہو
میں لوٹ جاؤں اسی سمت گر بہانہ لگے

ے میزان وقت فیصلہ خود دے گا دیکھنا
رکھا ہے کیا صنم کدۂ نام و ننگ میں

(۲۸)

ے

عہد جدید کا انسان اپنی اصل حقیقت کو پوشیدہ رکھنے کیلئے مصنوعی حیلوں، بناوٹ اور نمود و نمائش سے کام لیتا ہے تا کہ لوگوں کو دھوکہ دے سکے۔ اس سے معاشرے کی اخلاقی گراوٹ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ طاہر تونسوی کی غزل میں اس طرح کے کھوکھلے پن کی نفی ہوتی ہے۔ وہ اس طرح کے مکر و فریب اور مصنوعی پن کی نشاندہی بھی کرتے ہیں اور اس پر طنز بھی کرتے ہیں:

چہرے سے اب تو مکر کا غازہ اتار دو
پھینکے گا پھول کو ن ملامت کے سنگ میں

(۲۹)

کردار کی عظمت اور بڑائی اس میں ہوتی ہے کہ انسان تحمل، بردباری اور رواداری کا مظاہرہ کرے۔ ایسے طرز عمل کا اظہار کرنے والے افراد معاشرہ کیلئے تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں اور انکا وجود معاشرے کیلئے ایک عظیم نعمت سے کم نہیں ہوتا۔ طاہر تونسوی کی غزل میں اس طرح کی اخلاقی بلندی کے نمونے بھی ملتے ہیں:

جس پر تمام شہر نے کیں سنگ باریاں
طاہر وہ زندگی کی دعا دے گیا مجھے

(۳۰)

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اپنی غزل میں فلسفہ جبر و قدر کی گتھی کو بھی سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ان کے نزدیک انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے۔اس معاملہ میں وہ اعتدال کے قائل ہیں۔انکے نزدیک انسان نہ تو مجبور محض ہے اور نہ ہی کلی طور پر اپنی تقدیر بنانے میں آزاد۔"انسان کی جبیں کا زائچہ ریت پر نقش ہے" (مٹا کر دوبارہ لکھا جا سکتا ہے)انسان اپنی "رفعت قامتِ جنوں" (عزم واستقامت، جہد مسلسل، عشق صادق) سے اس میں تبدیلی کر کے "اوج کمال" تک پہنچ سکتا ہے۔انسان اپنی تشکیل خود کرتا ہے۔(اپنی محنت سے عظمت حاصل کرتا ہے)

اس طرح ڈاکٹر طاہر تونسوی کی غزلیہ شاعری انسان کو حرکت و عمل پر آمادہ کرتی ہے تاکہ انسان جہدِ مسلسل سے اوج کمال تک پہنچ سکے۔ریت پر جبیں کا زائچہ نقش ہونا اور ریت پر اپنے نقوش خود کھینچنا امکانات کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ریت پر لکھے گئے الفاظ یا بنائے گئے گھر پل بھر میں کم بھی کئے جا سکتے ہیں بڑھائے بھی جا سکتے ہیں ختم بھی کئے جا سکتے:

ے ریت پہ اب بھی نقش ہے میری جبیں کا زائچہ
رفعت قامتِ جنوں اوج کمال لے گئی

ے ریت پر کھینچے ہیں طاہرؔ میں نے خود اپنے نقوش
آج کل مصروف ہوں خود اپنی ہی تشکیل میں

ے لکھا نصیب میں جب ہے چراغ موسم زرد
اٹھا کے ہاتھ میں شاخ گلاب کیا رکھنا

حوالہ جات

۱۔ قاسم جلال، سید، ڈاکٹر، تو طے ہوانا، مشمولہ، ڈاکٹر طاہر تونسوی ایک مطالعہ، مرتب: شہزاد بیگ، ص ۳۷۲

۲۔ عاشق محمد خان، ڈاکٹر، اردو تنقید کے فروغ میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کی خدمات، ص ۶۸، ۶۹

۳۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، تو۔۔۔طے ہوا نا، پاکستان، بزم علم وفن، ۲۰۰۱ء، ص ۶۱، ۷۱، ۷۲، ۷۸، ۸۸

۴۔ ایضاً، ص ۷۷، ۹۲

۵۔ ایضاً، ص ۹۰

۶۔ ایضاً، ص ۶۹

۷۔ ایضاً، ص ۸۳

۸۔ ایضاً، ص ۸۷، ۸۸

۹۔ ایضاً، ص ۶۲، ۶۸، ۹۰، ۶۹

۱۰۔ ایضاً، ص۶۴، ۶۵، ۶۹، ۷۲، ۹۱

۱۱۔ ایضاً، ص۷۹، ۸۶

۱۲۔ سلطانہ مہر، شاعر۔۔ڈاکٹر طاہر تونسوی، مشمولہ، ڈاکٹر طاہر تونسوی ایک مطالعہ، مرتب: شہزاد بیگ، فیصل آباد، اکائی پبلشرز، ۲۰۰۵ء ص۳۵۷

۱۳۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، تو۔۔۔۔طے ہوانا، ص۶۱، ۶۲، ۶۳، ۷۰، ۷۲

۱۴۔ ایضاً، ص۶۷، ۶۸، ۷۱، ۷۲، ۷۵، ۸۴، ۹۷

۱۵۔ ایضاً، ص۶۱، ۶۴، ۶۵، ۸۴

۱۶۔ ایضاً، ص۶۸، ۸۰، ۸۸

۱۷۔ ایضاً، ص۶۸، ۷۱، ۷۶، ۸۱، ۹۱

۱۸۔ ایضاً، ص۷۸، ۷۹، ۸۱

۱۹۔ سلطانہ مہر، شاعر۔۔۔ڈاکٹر طاہر تونسوی، مشمولہ، ڈاکٹر طاہر تونسوی ایک مطالعہ، ص۳۵۳، ۳۵۴

۲۰۔ محمد عاشق خان، ڈاکٹر، اردو تنقید کے فروغ میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کی خدمات، ص۶۶

۲۱۔ سلطانہ مہر، شاعر۔۔۔ڈاکٹر طاہر تونسوی، مشمولہ، ڈاکٹر طاہر تونسوی ایک مطالعہ، ص۳۵۷

۲۲۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، تو۔۔۔۔۔۔طے ہوانا، ص۶۱، ۷۳، ۷۴، ۸۱

۲۳۔ ایضاً، ص۸۲

۲۴۔ ایضاً، ص۶۳، ۶۴، ۷۹، ۸۲

۲۵۔ ایضاً، ص۶۳

۲۶۔ ایضاً، ص۶۳، ۸۶

۲۷۔ ایضاً، ص۷۵، ۸۲، ۸۹

۲۸۔ ایضاً، ص۶۲، ۶۶، ۶۸، ۸۳

۲۹۔ ایضاً، ص۶۲

۳۰۔ ایضاً، ص۷۷

۳۱۔ ایضاً، ص۶۷، ۷۵، ۸۴